الرسالہ

Al-Risāla

October 2001 • No. 299 • Rs. 10

سمجھوتہ جب بھی ہوتا ہے لین دین کے اصول پر ہوتا
ہے نہ کہ فریق ثانی سے صدفی صد اپنی بات منوانے پر۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کی قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	5.00	دین انسانیت	60.00
مطالعۂ سیرت	60.00	تاریخ دعوت حق	5.00	فکر اسلامی	50.00
اسباق تاریخ	85.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	شتم رسول کا مسئلہ	50.00
تعمیر حیات	60.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	طلاق اسلام میں	5.00
تعمیر انسانیت	50.00	کتاب زندگی	65.00	مضامین اسلام	60.00
سفرنامہ (غیرملکی اسفار، جلد اول)	85.00	اقوالِ حکمت	25.00	حیات طیبہ	7.00
سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم	125.00	تعمیر کی طرف	8.00	باغ جنت	7.00
اسلام: ایک تعارف	80.00	تبلیغی تحریک	20.00	نار جہنم	7.00
اللہ اکبر	60.00	تجدید دین	25.00	سچا راستہ	8.00
پیغمبر انقلاب	50.00	عقلیاتِ اسلام	35.00	دینی تعلیم	7.00
مذہب اور جدید چیلنج	65.00	قرآن کا مطلوب انسان	25.00	خلیج ڈائری	10.00
عظمت قرآن	35.00	دین کیا ہے؟	7.00	رہنمائے حیات	7.00
عظمت اسلام	50.00	اسلام دین فطرت	20.00	تعدد ازواج	7.00
عظمت صحابہ	7.00	تعمیر ملت	7.00	ہندستانی مسلمان	60.00
دین کامل	80.00	تاریخ کا سبق	7.00	روشن مستقبل	7.00
الاسلام	45.00	فسادات کا مسئلہ	5.00	صوم رمضان	7.00
ظہور اسلام	50.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00	اسلام کا تعارف	5.00
اسلامی زندگی	40.00	تعارف اسلام	5.00	علما اور دور جدید	20.00
احیاء اسلام	35.00	اسلام پندرہویں صدی میں	5.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
راز حیات	65.00	راہیں بند نہیں	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	12.00
صراطِ مستقیم	40.00	ایمانی طاقت	7.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
خاتونِ اسلام	60.00	اتحاد ملت	7.00	یکساں سول کوڈ	5.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	سبق آموز واقعات	7.00	اسلام کیا ہے؟	8.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00	زلزلہ قیامت	10.00	میوات کا سفر	35.00
الربانیۃ	40.00	حقیقت کی تلاش	12.00	قیادت نامہ	35.00
کاروانِ ملت	45.00	پیغمبر اسلام	5.00	منزل کی طرف	5.00
حقیقت حج	30.00	آخری سفر	7.00	اسفار ہند	125.00
اسلامی تعلیمات	35.00	اسلامی دعوت	7.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹	100.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00	حل یہاں ہے	10.00	قال اللہ و قال الرسول	70.00
حدیث رسول	40.00	امہات المومنین	25.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱	90.00
راہ عمل	25.00	تصویر ملت	85.00	مطالعۂ قرآن	80.00
تعبیر کی غلطی	80.00	دعوت اسلام	50.00	مذہب اور سائنس	40.00
دین کی سیاسی تعبیر	25.00	دعوت حق	40.00		
عظمتِ مومن	7.00	نثری تقریریں	80.00		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 435 6666, 435 1128
Fax 435 7333, 435 7980
e-mail: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137 • Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4348404 • Fax (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

الرسالہ ' اکتوبر ' 2001

فہرست

قدرتی ڈھال

چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں وحشی تاتاری قبائل کی فوج لے کر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں داخل ہوا اور اس کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے بعد عرصہ تک وہ لوگ مسلم دنیا کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بناتے رہے۔ امام ابن تیمیہ (۱۳۲۸ = ۱۲۶۳ء) کا زمانہ وہی ہے جو اس تاتاری فتنہ کا زمانہ ہے۔

دمشق میں ایک بار ابن تیمیہ ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ اس مقام پر تاتاریوں کا ایک گروہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت وہ لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ابن تیمیہ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ ان کے پاس جائیں اور ان کو شراب پینے سے روکیں۔ ابن تیمیہ نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تک یہ لوگ نشہ کی حالت میں رہیں گے، مسلمان ان کی جارحیت سے محفوظ رہیں گے۔ ان کی ہوش کی حالت کے مقابلہ میں ان کی مدہوشی کی حالت زیادہ بہتر ہے ـــــ (سکرھم خیر من صحوھم)

موجودہ دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کے لئے یہ ایک قیمتی اصول ہے۔ لوگوں کو ان کی دلچسپیوں میں مشغول رہنے دیجئے، آپ ان کے فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔ یہ اصول دور جدید کے تاتاریوں پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتی دور کے تاتاری اس سے بھی زیادہ بڑے نشے میں مبتلا ہیں۔ یہ دولت کمانے کا نشہ ہے۔ جدید صنعتی انقلاب نے دولت کمانے کے بے حساب نئے مواقع کھول دئے ہیں۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے میں لگائے ہوئے ہے۔ برادران وطن میں یہ کیفیت اور بھی زیادہ ہے کیوں کہ وہ دولت کو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔

ایسی حالت میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے ـــــ بعض اوقات صبر و تحمل بہترین ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔

تدبیر اور توکل

قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے: وإن یمسسک الله بضر فلا کاشف له إلا هو وإن یمسسک بخیر فهو علی کل شیٔ قدیر (الأنعام ۱۷) یعنی اور اگر اللہ تم کو کوئی دکھ پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دکھ کو دور کرنے والا صرف اللہ ہے ــــــ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر تم کسی دکھ میں مبتلا ہو تو اس سے نجات کے لیے اللہ کے فرشتوں کا انتظار کرو۔ یہ دراصل دکھ کے وقت اعتدال پر قائم رہنے کی تعلیم ہے۔ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ فوراً کانٹے کو نکالنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ فوراً دوا کا استعمال کرے۔ اعتدال کے دائرہ میں دکھ کو دور کرنے کی کوشش کرنا ایک فطری امر ہے۔ خود فطرت ہی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ایسے موقع پر آدمی کو فوراً ضروری تدبیر کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ اعتدال کے دائرہ میں فطری تدبیر سے مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو ایسی حالت میں آدمی کو اللہ سے دعا کرنا چاہئے اور اللہ سے مدد کا طالب ہونا چاہئے۔ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ تدبیر کو ناکافی دیکھ کر وہ مایوسی کا شکار ہو یا قبروں اور درگاہوں کی طرف دوڑنے لگے یا اور کوئی ایسا اقدام کر بیٹھے جو اعتماد علی اللہ کے خلاف ہو۔ انسانی تدبیر کے بعد اللہ پر بھروسہ کرنا ہے نہ کہ کسی غیر اللہ کا سہارا ڈھونڈنا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اور اگر اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ دنیا کی کوئی بھلائی کسی آدمی کو ملے تو وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھ کر اس پر نازاں نہ ہو۔ وہ تواضع کی روش سے نہ ہٹے۔ کیوں کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ اللہ کے اِذن سے ملا ہے۔ اللہ جب چاہے، حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دے کہ ملی ہوئی چیز اس سے چھن جائے۔ اس آیت کی مزید تشریح ایک حدیث سے ہوتی ہے۔

الترمذی نے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی سواری کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے یا اے میرے بیٹے، کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تم کو نفع پہنچائے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو، اللہ تمہیں یاد رکھے گا۔ تم اللہ کو یاد کرو، تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ تم خوش حالی میں اللہ کو نہ بھولو، وہ تم کو تنگی میں نہ بھولے گا۔ جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو۔ اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو۔ کیوں کہ جو ہونے والا ہے وہ سب لکھا جا چکا ہے۔ پس اگر تمام انسان تم کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہیں جس کا فیصلہ اللہ نے تمہارے لیے نہ کیا ہو تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔ اور اللہ کے لیے عمل کرو شکر اور یقین کے ساتھ۔ اور جان لو کہ جو چیز تم کو ناپسند ہو اس پر صبر کرنے میں تمہارے لیے بہت زیادہ بھلائی ہے۔ اور اللہ کی مدد صبر کے ساتھ ہے۔ اور کشادگی تکلیف کے ساتھ ہے۔ اور بے شک آسانی مشکل کے ساتھ ہے۔ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۳۹۸/۵)

ایمانی زندگی تدبیر کے ساتھ توکل کا نام ہے اور توکل کے ساتھ تدبیر کا۔ تدبیر اگر انسانی محنت کا اظہار ہے تو توکل اللہ کے قادر مطلق ہونے کا اظہار۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کے ساتھ بری حالت بھی پیش آتی ہے اور اچھی حالت بھی۔ اور ان دونوں ہی کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے اور وہ آزمائش ہے (ونبلوکم بالشر والخیر فتنة) الانبیاء ۳۵۔

اس سے معلوم ہوا کہ دکھ اور سکھ اگرچہ بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، دونوں کی حیثیت ایک ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے۔ اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، انسان کو چاہئے کہ جب اس پر دکھ کی حالت پڑے تو وہ اپنے سکھ کی حالت کو یاد کرے اور اس طرح اپنے اس اعتماد کو زندہ رکھے کہ اللہ اس کے دکھ کو سکھ میں بدلنے پر قادر ہے۔ اسی طرح جب وہ زندگی میں سکھ کا تجربہ کرے تو وہ اپنے دکھ کے لمحات کو یاد کرے اور اس طرح اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرے کہ اللہ اگر چاہے تو اس سے سکھ کو چھین لے اور اس کو دکھ کی حالت میں مبتلا کر دے۔

عقیدۂ خدا اور سائنس

سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین اسی علم فطرت کا ظہور ہے، جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی تھی ــــ سنریهم ایاتنا فی الآفاق و فی أنفسهم حتی یتبین لهم أنه الحق (حم السجدہ ۵۳) یعنی ہم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کائنات کی جو نئی تصویر بنی ہے، وہ عین وہی ہے جو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے جدید سائنسی دریافتیں گویا کتاب الٰہی کے اشارات کی تفصیل ہیں اور اسی کے ساتھ اس کی دلیل بھی۔ یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جدید دریافت کے مطابق، کائنات کی ابتدا تقریباً ۲۵ بلین سال پہلے ہوئی۔ اس کے بعد مختلف تدریجی انقلابات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ اس پورے سفر کی روداد اس موضوع کی کتابوں میں پڑھ کر معلوم کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو محسوس طور پر کسی سائنسی پلے نیٹیریم (Planetarium) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے یہ پورا منظر واشنگٹن کے نیشنل پلے نیٹیریم میں دیکھا ہے۔

سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ ۲۵ بلین سال پہلے خلا میں ایک سپر ایٹم ظاہر ہوا۔ یہ ان تمام ذرات (particles) کا مجموعہ تھا جو موجودہ کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ گویا موجودہ پوری کائنات ایک بہت بڑے فٹ بال جیسے گولے کی صورت میں شدت کے ساتھ باہمی طور پر چمٹی ہوئی تھی۔ اس گولے کے تمام ذرات بے حد طاقتور کشش کے ساتھ ایک دوسرے سے داخلی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ معلوم طبیعیاتی قانون کے مطابق، یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیرونی سمت میں سفر کریں۔

اس وقت اس سپر ایٹم کے اندر نہایت طاقتور دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے فوراً بعد سپر ایٹم

کے ذرات بکھر کر تیزی سے بیرونی سمت میں سفر کرنے لگے۔اس کے بعد یہ ذرات وسیع خلا میں مختلف مجموعوں کی صورت میں اکٹھا ہو گئے۔انہیں مجموعوں سے خلا میں پائی جانے والی وہ دنیائیں بنیں جن کو ستارہ، سیارہ، کہکشاں، شمسی نظام، زمین اور چاند جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سُپر ایٹم کا یہ دھماکہ بیک وقت دو چیزیں ثابت کرتا ہے۔ایک یہ کہ یہاں کائنات سے الگ ایک طاقتور ہستی پہلے سے موجود تھی جس نے اپنی ارادی مداخلت کے ذریعہ یہ غیر معمولی واقعہ کیا کہ سپر ایٹم کے ذرات داخلی رُخ پر سفر کے بجائے بیرونی رُخ پر سفر کرنے لگے۔

اس واقعہ کا دوسرا عظیم پہلو یہ ہے کہ دھماکہ (explosion) ہمیشہ تخریبی نتائج کا سبب بنتا ہے۔پٹاخہ سے لے کر بم تک ہر دھماکہ بلا استثناء یہی خاصیت رکھتا ہے۔مگر سُپر ایٹم کا دھماکہ استثنائی طور پر غیر تخریبی تھا۔اس نے مکمل طور پر صرف صحت مند اور تعمیری نتائج پیدا کئے۔یہ استثنائی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا خالق لامحدود قدرت کا مالک ہے۔وہ یہ استثنائی اختیار رکھتا ہے کہ واقعہ کے ساتھ نتائج پر مکمل کنٹرول کر سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے۔وہ غبارہ کی مانند مسلسل طور پر بیرونی سمت میں پھیل رہی ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ایک متعین آغاز ہے۔اگر کائنات ابدی ہوتی تو وہ اپنی اس پھیلتی ہوئی نوعیت کی بنا پر اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔یہ ثابت ہونا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے، یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز کرنے والا ہے۔ایک غیر موجود چیز کا آغاز اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس سے پہلے کوئی موجود ہو جو اپنے ارادہ سے اُس کا آغاز کر سکے۔

کائنات میں ایسے بے شمار شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا منصوبہ ساز اور اس کا ناظم صرف ایک ہے۔اگر ایک سے زیادہ ناظم ہوتے تو یقینی طور پر کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔

مثال کے طور پر زمین اور سورج کا فاصلہ تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔یہ فاصلہ

مسلسل طور پر اپنی حالت پر بر قرار رہتا ہے۔ اگر اس فاصلہ میں تبدیلی آجائے تو اس کے مہلک نتائج پیدا ہوں گے۔ مثلاً اگر یہ فاصلہ بڑھ کر ۲۰ کرور میل دور ہو جائے تو زمین پر اتنی ٹھنڈ پیدا ہو کہ پانی، نباتات، حیوانات اور انسان سب منجمد ہو جائیں۔ اسی طرح یہ فاصلہ اگر کم ہو کر ۵ کرور میل ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ تمام چیزیں بشمول انسان جل کر ختم ہو جائیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اور زمین دونوں کا خدا ایک ہے۔ اگر دونوں کے خدا الگ الگ ہوتے تو دونوں الگ الگ اپنی مرضی چلاتے اور پھر یقینی طور پر یہ فاصلہ گھٹتا یا بڑھتا رہتا اور اس بے قاعدگی کی بنا پر زمین پر انسانی تہذیب کا وجود ناممکن ہو جاتا۔

نا معلوم حد تک وسیع کائنات میں ہمارا زمینی سیارہ ایک نادر استثناء ہے۔ یہاں پانی اور ہوا اور نباتات جیسی ان گنت چیزیں پائی جاتی ہیں جو انسانی زندگی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ جب کہ وسیع خلا میں معلوم طور پر کوئی بھی ایسی دنیا موجود نہیں جہاں بقائے حیات کا یہ سامان پایا جاتا ہو۔ یہ استثناء بتاتا ہے کہ یہ دنیا محض بے شعور مادہ کے ذریعہ نہیں بنی بلکہ وہ ایک باشعور ہستی کا تخلیقی کرشمہ ہے۔ اگر وہ محض مادی قوانین کے بے شعور تعامل کا نتیجہ ہوتی تو کائنات میں بہت سی ایسی زمینیں ہوتیں نہ کہ صرف ایک ایسی زمین۔

ہماری دنیا کی ہر چیز انتہائی حد تک با معنی ہے۔ چیزوں کی معنویت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک باشعور تخلیق کا نتیجہ ہے۔ کوئی دوسرا نظریہ اس حکمت اور معنویت کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔

مثلاً زمین کے حجم (سائز) کو لیجئے۔ زمین کا موجودہ حجم تقریباً ۲۵ ہزار میل کی گولائی میں ہے۔ یہ حجم بے حد با معنی ہے۔ چنانچہ یہ حجم اگر ۵۰ ہزار میل ہوتا تو زمین کی کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ وہ انسانی جسم کی بڑھوتری کو روک دیتی۔ اس کے بعد زمین پر صرف بالشتیے قسم کے انسان دکھائی دیتے۔ اس کے برعکس اگر زمین کا حجم گھٹ کر ۱۲ ہزار میل ہوتا تو اس کی قوت کشش اتنی کم ہو جاتی کہ وہ انسانی بڑھوتری کو روک نہ سکتی۔ انسان کا قد تاڑ کی طرح لمبا ہو جاتا۔ اس کے سوا اور بے شمار قسم کے غیر موافق حالات پیدا ہوتے جو انسان کی تمام تمدنی ترقیوں کو ناممکن بنا دیتے۔

مذکورہ پہلوؤں پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی اعتبار سے، یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے اور وہ یقینی طور پر صرف ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے جو انتخاب ہے وہ باخدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے لیے حقیقی انتخاب باخدا کائنات (universe with God) اور غیر موجود کائنات (no universe at all) میں ہے۔ یعنی اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہم کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چوں کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے اس لیے ہم خدا کے وجود کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں ہمارے لیے دوسرا کوئی ممکن انتخاب موجود نہیں۔

Change of Telephone Numbers

New Numbers:

Office Al-Risala	435 1128, 435 5454
Maulana Wahiduddin Khan	435 8729
Fax	435 7333, 435 7980
e-mail	info@goodwordbooks.com

میرٹھ کا سفر

میرٹھ مجھے بار بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ تاہم سفرنامہ کی نسبت سے پانچ سفر قابلِ ذکر ہیں۔ اس حیثیت سے میرٹھ کے لئے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۶۸ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد اُس زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی ۹ فروری ۱۹۶۸ میں شائع ہوئی تھی۔

میرٹھ کے لئے میرا دوسرا سفر جون ۱۹۷۹ میں ہوا۔ اس موقع پر وہاں میری چند تقریریں ہوئیں اور مختلف اہل علم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس سفر کا ایک واقعہ اللہ اکبر (صفحہ ۹۰) میں درج ہے۔

میرٹھ کے لئے میرا تیسرا سفر جون ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر خاص طور پر میرٹھ کے فساد کا جائزہ لینے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس سفر کی تفصیلی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۸۸ میں چھپ چکی ہے۔ میرٹھ کا چوتھا سفر سردھنہ کے سفر کے ذیل میں ہوا۔ اس سفر میں کچھ نئے اور انوکھے قسم کے تجربات ہوئے۔ اس سفر کی تفصیلی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۹۶ میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہوئی۔

میرٹھ کے لئے میرا پانچواں سفر ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ کو ہوا۔ اس پانچویں سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

میرٹھ مغربی یوپی کا ایک شہر ہے۔ جو دہلی سے ۷۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ابتدائی چار اسفار کی نوعیت موجودہ سفر سے مختلف تھی۔ پچھلے اسفار عام اداروں اور تنظیموں کی دعوت پر ہوئے۔ موجودہ پانچویں سفر کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حلقہ الرسالہ کی دعوت اور اس کے انتظام کے تحت ہوا۔

میرٹھ میں اللہ کے فضل سے الرسالہ مشن کا ایک مؤثر حلقہ بن گیا ہے۔ ان لوگوں کی مخلصانہ دعوت پر یہ سفر ہوا۔ اس سفر میں میرے ساتھ مولانا محمد عرفان قاسمی

(میرٹھ)اور مولانا محمد راشد خاں قاسمی (منڈولی) تھے۔

میرٹھ میں نوجوانوں کا ایک گروپ ہے جو مثبت فکر کی بنیاد پر اکٹھا ہوا ہے۔ وہ تعمیر اور دعوت کے میدان میں خاموش کام کر رہا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ لمبی مدت سے میرٹھ کی تصویر ایک پر تشدد شہر کی بنی ہوئی ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے اس تصویر کو بدلیں گے اور میرٹھ کو امن کا شہر بنائیں گے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے بذریعہ ٹیلی فون بتایا تھا کہ اس گروپ کی خواہش ہے کہ میں میرٹھ کا سفر کروں۔ اور وہاں کچھ وقت ان نوجوانوں کے ساتھ گزاروں۔

میں نے اس دعوت کو فوراً منظور کر لیا۔ اگر چہ آج کل میرا یہ حال ہے کہ میں اپنے کچھ علمی کاموں میں اتنا زیادہ مشغول ہو گیا ہوں کہ اسفار کا سلسلہ بہت کم کر دیا ہے۔ اس دوران میں نے بہت سے ملکی اور غیر ملکی سفر کے دعوت نامے قبول نہیں کئے۔ اگست–ستمبر ۲۰۰۰ کے لئے مجھے کئی بیرونی کانفرنسوں میں شرکت کے دعوت نامے موصول ہوئے۔ مثلاً پرتگال، فلسطین، نیویارک، اور انڈونیشیا، وغیرہ۔ مگر میں وہاں نہ جا سکا۔ لیکن میرٹھ کے نوجوانوں کے تعمیری اور دعوتی جذبات میرے لئے اتنا زیادہ پرکشش ثابت ہوئے کہ میں ان کی دعوت کو قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس پروگرام کے مطابق ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ کی صبح کو دہلی سے میرٹھ کا سفر کیا اور ۱۵ ستمبر کی رات کو وہاں سے واپسی ہوئی۔ ہم لوگ دہلی سے روانہ ہوئے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی روشنی چاروں طرف پھیلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس منظر کو دیکھ کر مولانا محمد عرفان صاحب نے کہا کہ اس پروگرام کے لئے میں میرٹھ سے روانہ ہوا تو رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اب ہم دہلی سے میرٹھ کا سفر کر رہے ہیں تو ہر طرف روشنی پھیل چکی ہے۔ یہ گویا علامت ہے جو بتا رہی ہے کہ ہمارا تاریک دور بہت جلد ختم ہونے والا ہے اور عنقریب ہمارے لئے روشن دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ بلکہ اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

دہلی کی سڑکوں پر ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت کے سرسبز مناظر تھے۔ ان درختوں کے پیچھے دونوں طرف جدید طرز کی عمارتیں جھانکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان سب کے اوپر سورج ایک عالمی چراغ کی مانند ہر طرف روشنی بکھیر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دوڑتی ہوئی گاڑیاں سڑک پر نظر آتی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اگر ہم آج سے پانچ سو سال پہلے اس راستہ پر چل رہے ہوتے تو اس وقت یہاں منظر بالکل دوسرا ہوتا۔ پچھلی صدیوں میں دنیا نے ''غیر متمدن دور'' سے نکل کر ''متمدن دور'' میں قدم رکھا ہے۔ تاہم اس ظاہری ترقی کے باوجود آج کے مسائل، ماضی کے مسائل کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔

پچھلے دور کا انسان سکون کی زندگی گزارتا تھا، آج کسی کو سکون حاصل نہیں۔ پچھلے دور میں انسانی قدریں زندہ تھیں، مگر آج کے زمانہ میں ان کا وجود بہت کم نظر آتا ہے۔ پچھلے دور کے انسان کے پاس مذہب اور اخلاق کے لئے کافی وقت ہوتا تھا، مگر آج کا انسان مادی بھاگ دوڑ میں اتنا مصروف ہے کہ مذہب اور اخلاق جیسی چیزوں کے لئے اس کے پاس کوئی وقت نہیں۔

میں اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ ہماری گاڑی کے پاس سے ایک بھاری ٹرک گزرا، اس کے انجن سے نکلنے والا تیز دھواں ہماری گاڑی کی کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ اس تیز دھویں نے تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو منتشر کر دیا۔ مگر اسی تلخ تجربہ میں میرے سوال کا خاموش جواب بھی چھپا ہوا تھا۔ ٹرک کا کثیف دھواں گویا جھنجھوڑنے والی زبان میں میرے سوال کا جواب تھا۔ یہ دھواں میرے لئے جدید تہذیب کی ایک پر شور علامت بن گیا۔ اس نے علامتی طور پر مجھے بتایا کہ جدید تہذیب اگرچہ بظاہر خوشنما ترقیاں لائی ہے مگر اسی کے ساتھ وہ بے شمار مشینی برائیاں بھی لائی ہے۔ اس کی ایک مثال ٹرک کا یہ کثیف دھواں ہے۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ قدیم زمانہ میں انسان نے "جنتِ شداد" جیسے افسانے بنائے۔ اور پریوں کی کہانیاں لکھیں۔ یہ گویا انسان کی چھپی ہوئی تمنا کا اظہار تھا کہ وہ اسی دنیا میں اپنی جنت تعمیر کرسکے۔ جدید سائنسی و صنعتی انقلاب کے بعد جو بے شمار قسم کی مادی ترقیاں ظہور میں آئیں اس نے گویا قدیم انسان کی آرزوؤں کو واقعہ بنا دیا۔ اب "جنت شداد" بھی عملاً تعمیر ہو گئی اور پریوں کی دنیا بھی اب ایک ایسا عمومی واقعہ ہے جس کو ہر آدمی تصویروں کی صورت میں اخبار، ٹی وی اور سینما وغیرہ کے ذریعہ دیکھ رہا ہے۔

مگر عین اسی وقت انسان کو محسوس ہوا کہ ان ظاہری ترقیوں نے اس سے وہی اصل چیز چھین لی ہے جو اس کو سب سے زیادہ مطلوب تھی، یعنی خوشی اور سکون۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد یاد آیا جو آپ نے غزوۂ خندق کے موقع پر فرمایا تھا ـــــ اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔

دور جدید اپنی تمام ظاہری ترقیوں کے ساتھ گویا اس ارشاد رسول کی تفسیر ہے۔ سکون و مسرت سے خالی یہ خوشنما مادی ترقیاں گویا خاموش زبان میں یہ اعلان کر رہی ہیں کہ انسان جو پُر راحت اور پُر مسرت زندگی چاہتا ہے وہ صرف آخرت کی دنیا میں مل سکتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ موجودہ دنیا کے وسائل کو جنت کی تعمیر میں لگائے: لمثلِ ھذا فلیعمل العاملون (الصافات ۶۱)

مولانا محمد عرفان قاسمی (۴۰ سال) ۱۹۸۰ سے الرسالہ کا مسلسل مطالعہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ الرسالہ بند ذہن کو کھولتا ہے اور ذہنی جمود کو توڑ کر اس کو آفاقی بناتا ہے۔

الرسالہ پڑھنے سے پہلے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امت مسلمہ کا سفر ایک بند گلی میں پہنچ کر رک گیا ہے۔ دوسرے اخبارات و رسائل اور جلسوں کی تقریروں سے یہی سبق ملتا تھا۔ مگر جب میں نے الرسالہ پڑھنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں کھلی شاہراہ پر آگیا ہوں۔ اب ہر طرف تاریکی کے بجائے روشنی اور تنگی کے بجائے کشادگی نظر آنے لگی۔

ہماری گاڑی چلتی ہوئی مودی نگر کے صنعتی شہر میں پہنچی جو دہلی اور میرٹھ کے درمیان واقع ہے۔ میرے شریک سفر مولانا محمد راشد خاں قاسمی (۳۰سال) نے بتایا کہ میری پیدائش اسی مودی نگر میں ہوئی۔ میرے والد عبدالمعید خاں مرحوم (وفات ۱۹۹۷) یہاں سروس کرتے تھے۔ میں نے مولانا محمد راشد صاحب سے پوچھا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ انہوں نے ان الفاظ میں اپنا تاثر بتایا کہ جب میں مظاہر العلوم سہارنپور میں (۱۹۸۴۔۸۷) میں زیر تعلیم تھا تو مولانا محمد عرفان قاسمی نے جو میرے استاذ بھی ہیں، اپنی طرف سے میرے نام الرسالہ جاری کردیا۔ جب میں نے الرسالہ پڑھنا شروع کیا تو ابتداء میں مجھے اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے، خاص طور پر اس بات پر کہ الرسالہ میں ہمیشہ صبر کی بات کی جاتی ہے جب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم کیا جارہا ہے۔ ایسے میں صبر کی تلقین کرنا گویا مسلمانوں کو اُلٹی خوراک دینا ہے۔ تاہم میں ان شکوک کے باوجود الرسالہ پڑھتا رہا۔ آخر کار مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ الرسالہ میں جو بات کہی جاتی ہے وہ ہمیشہ قرآن وحدیث کے حوالہ سے کہی جاتی ہے۔ وہ الرسالہ کی ذاتی بات نہیں ہوتی۔

پھر مجھے محسوس ہوا کہ جب میں دوسروں کی تحریریں پڑھتا ہوں تو ان میں ہمیشہ لڑائی جھگڑا اور نفرت و تشدد ملتا ہے۔ ان تحریروں میں نہ سکون کا سامان ہوتا ہے اور نہ ان سے مستقبل کے بارے میں روشنی ملتی ہے۔ اس کے برعکس الرسالہ کی تحریروں میں ذہنی اطمینان کا سامان ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ ایسی واضح رہنمائی ہوتی ہے جس سے راستے روشن ہوں اور عمل کے مواقع نظر آئیں۔ اب میری شدید خواہش یہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے آخر عمر تک اس مشن سے جڑا رہوں اور اس کے مثبت پیغام کو ساری دنیا میں پہنچاؤں۔

مولانا محمد راشد خاں نے بتایا کہ میرے والد عبدالمعید خاں صاحب مرحوم اچھے

تعلیم یافتہ اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں والد صاحب کے آخری زمانہ میں ان کو الرسالہ پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ وہ اس کے مضامین کو سن کر بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بیٹے، تم اس کو ضرور پڑھا کرو۔

انہوں نے کہا کہ میرے والد صاحب نے مختلف ملکوں کا سفر کیا تھا۔ مسلم دنیا میں انہوں نے ہر جگہ ظلم و تشدد کے تذکرے سنے تھے۔ مسلم رہنماؤں کی بھڑکیلی تقریروں اور جوشیلی تحریروں سے وہ بہت نالاں تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مسائل کے لئے وہ خود ان کے رہنماؤں کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ جب ان کو الرسالہ ملا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ عین وہی چیز ہے جسے ان کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ جب بھی الرسالہ کا نیا شمارہ آتا تو وہ اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوتے اور بار بار اس کے لئے دعائیں کرتے۔

راستہ میں مولانا محمد عرفان قاسمی صاحب نے بتایا کہ میلہ نوچندی (میرٹھ) کے ترنگے گیٹ پر پہنچنے پر ہمارے ساتھی آپ کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ وہاں کھڑے ہوئے آپ کو ملیں گے۔ انہوں نے مولانا محمد عرفان صاحب سے پوچھا تھا کہ ہم ان کو ہار ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہار ڈالنا جائز ہے یا ناجائز۔

میں نے یہ بات سنی تو میں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر اس قسم کی نمائشی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ میری رائے یہ ہے کہ ہر چیز کو جائز اور ناجائز کا سوال بنانا خود ناجائز ہے۔ کیوں کہ فقہ اسلامی کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ الاصل فی الاشیاء الإباحة (چیزوں کی اصل ان کا مباح ہونا ہے)

سفر کرتے ہوئے ہم لوگ میرٹھ پہنچے تو گھڑی میں ۹ بج چکے تھے۔ یہاں سڑک کے کنارے الرسالہ کے قارئین کا ایک گروہ موجود تھا۔ ان سے ملاقات کے بعد ہم لوگ جناب محمد شہزاد علی خاں صاحب کے مکان (شاستری نگر) پہنچے۔ یہاں تقریباً دو گھنٹہ قیام رہا۔ میرٹھ کے قارئین الرسالہ یہاں جمع ہوگئے۔ ان کی تعداد تقریباً ۳۰ تھی۔

ان لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے سوالات پیش کئے جاتے رہے جن کے جواب میں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں دئے۔ صحیح بخاری (کتاب الرضیٰ) کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مؤمن کی صفت خاص یہ ہے کہ اس کے اندر اکڑ نہیں ہوتی۔ وہ تواضع اور فروتنی میں جیتا ہے۔ اللہ کی عظمت کا یقین اور آخرت کی جواب دہی کا احساس اس سے اکڑ کی نفسیات چھین لیتا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اکڑ کی نفسیات نہ ہونا کوئی کمزوری کی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور انسان وہ ہے جو اکڑ جیسے جذبات سے خالی ہو جائے۔

ایک اور سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل دعوت ہے۔

انسان کے اندر اعلیٰ صفات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے ایک اعلیٰ مشن ہو۔ اعلیٰ مشن ہی وہ واحد کلید ہے جو کسی شخص کے اندر اعلیٰ انسانی صفات پیدا کرتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اگر دعوت کی اسپرٹ صحیح معنوں میں پیدا ہو جائے تو ان کے اندر دینی اسپرٹ بھی آجائے گی۔ اور اتحاد و اتفاق بھی پیدا ہوگا۔ اخلاقی اور انسانی صفات بھی پیدا ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دعوتی کام کی بنا پر اللہ کی خصوصی رحمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔

ایک اور سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ یہ نظریہ غلط ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرو اور پھر دعوت کا کام کرو۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (جلد اول صفحہ ۸۱) میں لکھا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ دعوت کے لئے ذاتی اصلاح شرط نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک غیر عملی شرط ہے۔ اگر لوگوں کے دل میں یہ بٹھا دیا جائے کہ اپنی اصلاح کی تکمیل سے پہلے دعوتی کام نہ کرنا چاہئے تو دعوتی کام کبھی وجود میں نہیں آئے گا، ایک حقیقی مومن کبھی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اس کی اصلاح ہو گئی، کیوں کہ حقیقی مومن اللہ سے

ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ کرنے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ گویا کہ مومن وہ ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو غیر اصلاح یافتہ سمجھے۔ ایسی حالت میں دعوت کا کام ہمیشہ رکا رہے گا۔ اگر اہل ایمان ہمیشہ اپنے بارے میں یہ سمجھتے رہیں کہ میں تو ایک غیر اصلاح یافتہ انسان ہوں تو پھر میں دعوت کا کام کیسے کروں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دعوت عام اور ذاتی اصلاح کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے۔

پھر میں نے کہا کہ دعوت کی سب سے زیادہ اہم اور لازمی شرط یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور بے زاری کی فضا نہ ہو بلکہ معتدل فضا ہو، یہی چیز دعوت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ یک طرفہ صبر واعراض کے ذریعہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تلخی کو دور کریں۔ مفروضہ اور غیر مفروضہ ہر قسم کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے دعوت کا ماحول پیدا کریں۔ یہ خدانخواستہ بزدلی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم ترین عبادت ہے۔ جو شخص اس روش کا ثبوت دے اس کو بے حساب اجر عطا کیا جائے گا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ ابھی تک زیادہ تر ذاتی طور پر کام کر رہے ہیں، آپ نے کوئی بڑا ادارہ نہیں بنایا۔ میں نے کہا کہ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کا حلقہ اللہ کے فضل سے ہر جگہ موجود ہے، جیسا کہ خود میرٹھ میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہی ہمارا ادارہ ہے۔ در ودیوار کی صورت میں جو بڑے بڑے ادارے قائم ہوتے ہیں وہ کوئی بہت اچھی علامت نہیں۔ اس قسم کے ادارے ہمیشہ کسی امت کے دور زوال میں بنائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی نبی کی زندگی میں موجودہ قسم کے بڑے بڑے ادارے قائم نہیں ہوئے۔ پیغمبر کی زندگی میں اس کا مشن اسپرٹ کے زور پر چلتا ہے۔ اس زمانہ میں اسپرٹ ہی ادارہ کا قائم مقام ہوتی ہے۔ بعد کی نسلوں میں جب اسپرٹ

کمزور پڑ جاتی ہے اور ظواہر پسندی بڑھ جاتی ہے، اس وقت بڑی بڑی عمارتیں بنتی ہیں اور عالیشان ادارے قائم ہوتے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ ادارے دراصل روح دین کا قبرستان ہوتے ہیں۔ ان عالیشان اداروں میں بظاہر سب کچھ ہوتا ہے مگر وہی چیز نہیں ہوتی جو اصلاً مطلوب ہے، یعنی دین کی روح اور اس کی اسپرٹ۔ اسی حقیقت کو اقبال نے خدا کی طرف سے اس طرح بیان کیا ہے۔

میں ناخوش وبیزار ہوں مرمر کی سلوں سے   میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو

مسٹر ایس شفیق احمد ایڈوکیٹ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ مسلم معاشرہ میں عصبیت، طبقہ واریت اور ذات پات کے رجحان سے ملت کو منتشر و منقسم کیا جارہا ہے۔ اس سیاسی حربہ سے مسلم کی حفاظت کے لئے دعوت کا کیا لائحہ عمل ہے۔

میں نے کہا کہ ایک درخت سوکھ رہا ہو تو اس کو دوبارہ ہرا کرنے کے لئے ایک سو ایک نسخے نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی صحیح نسخہ ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس کی جڑوں کو پانی دیا جائے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جو کمیاں ہیں وہ سب کی سب اس لئے ہیں کہ وہ ایک بے حقیقت گروہ بن کر رہ گئے ہیں۔ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ، دونوں ہی کے لئے اصلاح کا نسخہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ ان کو ایک اعلیٰ مقصد پر کھڑا کردیا جائے۔ اعلیٰ مقصد اپنے آپ تمام انسانی صفات پیدا کردیتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو اسی اعلیٰ مقصد پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور وہ مقصد بلاشبہ دعوت الی اللہ ہے۔ جس دن مسلمانوں میں دعوت الی اللہ بطور مقصد شامل ہو جائے، تو بقیہ تمام صفات اپنے آپ ان کے اندر پیدا ہو جائیں گی۔

ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ مسجد الفاروق (زیدی فارم) پر پہنچے، یہاں عمومی جلسہ رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ، کچھ غیر مسلم حضرات بھی موجود تھے۔ یہ جلسہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اس جلسہ میں تقریر کا عنوان اسلام اور امن تھا۔ میں

نے کہا کہ امن کی تعریف عام طور پر جنگ کی غیر موجودگی (absance of war) کی جاتی ہے۔ مگر یہ تعریف ادھوری ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امن ایک طریق کار ہے۔ اور طریق کار کے اعتبار سے امن کو بہر حال جنگ اور تشدد پر فوقیت حاصل ہے۔

چنانچہ صحیح البخاری میں ایک حدیث آتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: إن اللہ یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف۔ (اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا) پوری انسانی تاریخ اس قول رسول کی صداقت کی تصدیق کرتی ہے۔ تاریخ کی تمام بڑی بڑی کامیابیاں امن کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔ جنگ کے ذریعہ کوئی حقیقی کامیابی کبھی کسی کو نہیں ملی۔

امن کا ایک طاقت ہونا اسلام کی پوری تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ دور اول میں سوا لاکھ صحابہ کا جو قیمتی گروہ بنا تھا وہ سب کا سب پر امن جدو جہد کے ذریعہ بنا تھا۔

جن لوگوں کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے وہ چار قسم کے لوگ تھے ــــــ مہاجرین، انصار، طلقاء اور وافدین۔

مہاجرین وہ ہیں جو مکہ کی تیرہ سالہ مدت میں اسلام لائے، جب کہ اس پوری مدت میں کبھی جنگ نہیں ہوئی۔ انصار وہ لوگ ہیں جو مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے، مدینہ پر کبھی فوج کشی نہیں کی گئی۔ طلقاء ان مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو فتح مکہ کے بعد مکہ میں اسلام لائے۔ یہ لوگ بھی جنگ کے بغیر اسلام میں داخل ہوئے۔ کیوں کہ فتح مکہ کے وقت اور نہ اس کے بعد وہاں کوئی جنگی طاقت استعمال کی گئی۔ اس کے بعد وافدین کا دور ہے۔ ہجرت کے آخری سالوں میں عرب کے قبائل سے کثرت سے وفود مدینہ آئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ وافدین بھی جنگ کے ذریعہ نہیں بلکہ پر امن تبلیغ کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہی معاملہ اسلام کی تاریخ میں بار بار پیش آتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاری سمرقند سے لے کر حلب تک مسلم دنیا پر قابض ہو گئے۔

اس وقت وہ اتنا زور آور تھے کہ ان کے مقابلہ میں جنگ کا کوئی سوال نہ تھا مگر اسلام کی پر امن دعوتی طاقت ظاہر ہوئی اور اس نے بیشتر تاتاریوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔

مسجد کے اس جلسہ میں مولانا محمد عرفان قاسمی نے بھی تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے: ''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان داعی الی اللہ مولانا وحید الدین خاں موجود ہیں۔ آپ حلقۂ الرسالہ کی دعوت پر یہاں آئے ہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ الرسالہ کا مشن کیا ہے۔ الرسالہ فکر کی کئی تعریفیں کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کہا جاسکتا ہے کہ الرسالہ حقیقت پسندی کی تعلیم دیتا ہے۔ یا لوگوں کو باشعور بناتا ہے یا اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک فکر الرسالہ کی صحیح تعریف یہ ہے کہ الرسالہ فکر نام ہے مسائل انسانی کے قرآنی حل کا۔ یعنی انسانیت کو جو مسائل درپیش ہیں ان کا قرآنی حل کیا ہے وہ الرسالہ میں بتایا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں شروع ہی سے ایک سوال تھا کہ قرآن تمام مسائل کا حل ہے لیکن اس کے باوجود مسلم قوم سب سے زیادہ مسائل سے دوچار ہے۔ تو ایسا کیوں ہے۔ میں نے اس نقطۂ نظر سے الرسالہ کا مطالعہ کیا تو میں نے پایا کہ الرسالہ تمام مسائل میں قابلِ فہم قرآنی رہنمائی دیتا ہے۔ میں تقریباً بیس سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ان بیس سالوں میں تقریباً ۱۵ سال میں نے سخت تنقیدی انداز میں اس کا مطالعہ کیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر مجھے کوئی بات قرآن و حدیث کے خلاف نظر آئی تو میں الرسالہ کو فوراً چھوڑ دوں گا۔ لیکن اس دوران سچائی مجھ پر ظاہر ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا صاحب جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف قرآن و حدیث کی بات کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں کہتے''۔

مسجد میں تقریر کے بعد سوال و جواب کا دور شروع ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ دستوری طور پر ہمارے جو حقوق ہیں حکومت اس پر ایمانداری سے عمل نہیں کر رہی ہے

بلکہ اس کے قول وعمل میں تضاد ہے، ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ کسی گروہ کو اس کا حق نہ دستور کے ذریعہ ملتا ہے، اور نہ کسی حکومت کے ذریعہ۔ اس معاملہ میں اصل چیز داخلی اہلیت ہے۔ اگر اس گروہ کے اندر اہلیت ہے تو اس کو اس کا واقعی حق مل کر رہے گا۔ اور اگر اہلیت نہیں ہے تو کوئی بھی دوسری چیز اس کے کام آنے والی نہیں۔

ایک سوال، مسلم مسائل کے متعلق تھا۔ کہا گیا کہ انتظامیہ اور پولیس اپنے فرائض متعصبانہ انداز سے انجام دیتی ہے۔ حتی کہ تشدد تک کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس قسم کے نظریہ سے اتفاق نہیں۔ یہ سب اخباری باتیں ہیں۔ میرا یقین قرآن کی اس آیت پر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم کو جو بھی مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰) اس آیت کے مطابق، ہر مصیبت کا اصل سبب خود آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ ایسی حالت میں ہمارا کام احتساب خویش ہونا چاہئے نہ کہ احتساب غیر۔

ایک اور سوال یہ تھا کہ آپ جو صبر واعراض کی تلقین کرتے ہیں آخر کار یہ کب تک۔ میں نے کہا کہ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ خدا کی عبادت کب تک۔ صبر کوئی بزدلی نہیں، وہ ایک عبادت ہے، بلکہ وہ افضل ترین عبادت ہے (الزمر ۱۰)۔ ایسی حالت میں آپ کو چاہئے کہ صبر کے مواقع کو بشارت کے روپ میں لیں، اس کو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک تحفہ سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک ایجابی عمل ہے نہ کہ کوئی سلبی عمل۔ وہ ساری عمر جاری رہتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ انفرادی اور اجتماعی دعا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر دعا کرنا کیسا ہے۔

میں نے کہا کہ دعا خدا اور بندے کے درمیان کا ایک معاملہ ہے، اس لئے اصلاً دعا

کو تنہائی اور خاموشی کی صورت میں ہونا چاہئے۔ لیکن ہر عموم میں استثناء ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت جہری دعا کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل تفسیر روح المعانی میں سورہ الاعراف آیت ۵۵ کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ کس عالم کی تفسیر سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اور کس تفسیر کو زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن کی تفسیریں کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ ہر تفسیر کی کوئی نہ کوئی انفرادی خصوصیت ہے اور ہر ایک سے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ میں خود ہر تفسیر کو دیکھتا ہوں۔ تاہم القرطبی کی الجامع لاحکام القرآن زیادہ تر میرے مطالعہ میں رہتی ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تفسیری روایات اور سلف کے اقوال یکجا مل جاتے ہیں۔ اس سے آیات کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ایک سوال موجودہ صورت حال کے تحت مسلمانوں کی ملی اور سیاسی قیادت کے بارے میں تھا۔ مسلمانوں میں قیادتی قحط کیوں ہے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ فقدان قیادت نہیں ہے بلکہ فقدانِ قبولیتِ قیادت ہے۔ قوم کی قبولیت سے کوئی شخص قائد بنتا ہے۔ جب قوم میں قبولیت کا مزاج ہی نہ ہو تو کوئی قائد کس طرح قائد بنے گا۔

میرٹھ میں شام کے وقت جناب سید محمود علی صاحب (شاستری نگر) کے مکان پر ایک پریس کانفرنس ہوئی جس میں ہندی اخباروں کے نمائندے شریک ہوئے۔ پریس کانفرنس میں بہت سے سوالات کئے گئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال مسلمانوں کے دینی مدارس کے بارے میں تھا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے دینی مدارس پر اپنے میگزین "الرسالہ" (ستمبر ۲۰۰۰) میں تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مدارس ملک کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ مدارس گویا اچھے شہری تیار کرتے ہیں۔

بابری مسجد کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک عدالت میں موجود ہے، اور جو مسئلہ عدالت میں زیر سماعت ہو اس کو عدالت ہی ختم کر سکتی ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اعلان کریں کہ عدالت جو فیصلہ کرے گی وہ ہم کو بلا شرط منظور ہوگا۔ اس معاملہ میں عدالت کو نظرانداز کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ملک میں نراج کی حوصلہ افزائی کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ جو بلاشبہہ تمام برائیوں میں سب سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ڈیموکریسی کے نظام میں ہر فریق برابر کا حق رکھتا ہے۔ خواہ وہ اقلیت میں ہو یا اکثریت میں۔ ڈیموکریسی اور ڈکٹیٹر شپ میں یہی فرق ہے۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد ڈیموکریسی کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ تفریق و امتیاز کی بات کرے۔ اس قسم کی بات کسی ایک گروہ کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ پورے سسٹم کو برباد کر دینے والی ہے۔ اگر سسٹم برباد ہوتا ہے تو اس کا نقصان ہر ایک کو پہنچے گا۔

سٹی چینل ٹی وی (ہل چل) نے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انہوں نے مختلف سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ اسلامی مرکز کے صدر ہیں۔ یہ بتایئے کہ ایسا کیوں ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات سے ہٹ گئے ہیں۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بات عمومی طور پر درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ مسلمان اسلامی تعلیمات سے ہٹ گئے ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ بہت سے مسلمان اسلامی تعلیمات پر قائم ہیں۔ اس کی ایک مثال تبلیغی جماعت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ علماء اور مدارس بھی اس کا ایک نمونہ ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ عروج و زوال کے واقعات ہر قوم میں ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اسلام میں تجدید و احیاء کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور خدا کے فضل سے آج بھی جاری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو

مصلحین کو اصلاحی عمل کا ثواب کیسے ملے۔

مسجد الفاروق میں ظہر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حلقۂ الرسالہ کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ دعوتی کام کے سلسلے میں آپ کا مشورہ کیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ صبر داعی کی طاقت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ الصبر معول المؤمن (صبر مومن کا ذریعۂ اعتماد ہے) میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسی جامع نصیحت ہے کہ اگر اس کو کوئی پکڑ لے تو اس کو دوسری نصیحت کی ضرورت نہیں۔ صبر بلاشبہ تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔

محمد شہزاد علی خاں صاحب کے یہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے کے بعد ایک سوال کیا گیا کہ آپ نے لوگوں کو کیا پروگرام دیا ہے۔ میں نے کہا کہ پروگرام دیا نہیں جاتا بلکہ خود بنایا جاتا ہے۔ پروگرام کا سرچشمہ دل کا طوفان ہے۔ لفظوں میں کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ آپ کے دل میں اللہ کا ڈر ہونا اور دوسروں کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہونا، یہی پروگرام بناتا ہے۔ آپ پروگرام مانگئے نہیں بلکہ خود پروگرام ساز بنئے۔

جناب محمد راشد صاحب انصاری (۳۰ سال) نے ایک عمدہ بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ خبروں میں جیتے ہیں، وہ حقیقت میں نہیں جیتے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ لوگ جو کچھ اخباروں میں پڑھتے ہیں اسی سے وہ رائے بنالیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اخباری رپورٹ میں بیک وقت دو خامیاں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ہر اخبار انتخابی رپورٹنگ کرتا ہے۔ یعنی کچھ خبروں کو چھاپنا اور کچھ کو چھوڑ دینا۔ مزید یہ کہ اس کی یہ انتخابی رپورٹنگ اس صحافتی اصول پر مبنی ہوتی ہے کہ اچھی خبر کوئی خبر نہیں Good news is no news۔ اس صحافتی اصول کی بنا پر ہر اخبار کی رپورٹنگ نہ صرف جزئی ہوتی ہے بلکہ وہ ناقص بھی ہوتی ہے۔ یعنی وہ قوم یا فرقہ کے بارہ میں بری خبروں کو چھاپتا ہے اور اچھی خبروں کو نہیں چھاپتا۔

مزید یہ کہ اکثر اخبار خبروں کو گھٹا کر یا بڑھا کر چھاپتے ہیں۔ اس بنا پر کسی فرد یا

کسی جماعت کی تصویر جو اخبارات میں آتی ہے وہ ناقص ہوتی ہے۔

شام کو محمد شہزاد علی صاحب کے گھر پر خواتین اکٹھا ہوئیں۔ ان کو نصیحت کرتے ہوئے میں نے چند باتیں کہیں۔ ایک بات یہ تھی کہ آپ لوگ بے شکایت جینا سیکھیے۔ اس دنیا میں عورت اور مرد دونوں کو شکایتوں کے درمیان جینا پڑتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا پیش آتا ہے جو آپ کے دل میں دوسروں کے خلاف شکایت کا جذبہ پیدا کردے۔ یہی اس دنیا میں کسی عورت یا مرد کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ اس دنیا میں کامیاب صرف وہ شخص ہے جو شکایتوں کے طوفان میں اپنے دل کو شکایتوں سے خالی رکھے۔ جو شکایت کے باوجود بے شکایت بن کر رہ سکے۔

بچوں کی تربیت کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اصل تربیت یہ نہیں ہے کہ آپ ایک مقرر وقت پر جمع کر کے بچوں کو دین کے مسائل بتائیں۔ بچوں کی تربیت اس قسم کے وقتی وعظ سے نہیں ہوتی بلکہ تربیت کا اصل ذریعہ گھر کا ماحول ہے۔ اگر آپ کے گھر میں اخلاق اور انسانیت کا ماحول ہو۔ آپ کے گھر میں کسی کی غیبت اور شکایت نہ کی جاتی ہو، اور آپ کے گھر میں دوسروں کو عزت دینے کا ماحول ہو، خواہ وہ اپنا ہو یا غیر تو یہ ماحول آپ کے گھر کو ایک زندہ تربیت گاہ بنادے گا۔ اس کے بعد کسی رسمی وعظ کی ضرورت نہ ہوگی۔

الرسالہ ستمبر ۲۰۰۰ (دینی مدارس) پڑھنے کے بعد مولانا محمد عرفان قاسمی نے اپنا جو تاثر بیان کیا وہ انہیں کے الفاظ میں یہ تھا: میں نے الرسالہ کے اس شمارہ کو بہت غور سے پڑھا۔ سطور کو بھی پڑھا اور بین السطور کو بھی۔ سطور کے اندر آپ نے دینی مدارس کی افادیت کو انتہائی طاقتور دلائل کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ اور بین السطور میں آپ کی ایک نئی شخصیت نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے اپنے آپ کو قافلۂ مدارس کا ایک فرد شمار کیا ہے۔ "دینی مدارس" کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کے اندر جو لوگ دین کی خدمت کر رہے ہیں وہ اپنے اپنے دائرہ کے اندر متحرک

ہو جائیں۔ دوسرا احساس یہ ہوا کہ جو تعلیم آپ دوسروں کو الرسالہ میں دیتے ہیں خود اس کو مبالغہ کی حد تک پکڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون میں آپ نے لکھا تھا کہ کسی شخص کے اندر کوئی خوبی ہو تو اس خوبی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ کیوں کہ یہ خدا کی نعمت کا اعتراف ہے۔ دینی مدارس کے اندر میں نے دیکھا کہ آپ نے ان حضرات کی شخصیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے جن سے آپ کو کچھ نظریاتی اختلاف تھا۔"

الرسالہ کے ایک قاری نے کچھ لوگوں کا یہ قول دہرایا کہ آپ نے الرسالہ ستمبر ۲۰۰۰ میں لکھا ہے کہ آپ نے ۱۹۶۶ میں مولانا عبد الباری ندوی سے بیعت کرلی۔ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بیعت کا اسلام میں حکم کیا ہے۔ آپ کی کتاب تجدید دین سے تو یہ ذہن بنتا تھا کہ بیعت وغیرہ اسلام میں اضافہ ہے۔ لیکن دینی مدارس پڑھنے کے بعد جب آپ کا یہ اعتراف دیکھا تو لوگ متحیر ہوگئے۔

میں نے کہا کہ بیعت کے بارے میں تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں بیعت ایمان لی۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام میں اس قسم کی بیعت کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ کی بیعت کے معاملہ کو پیغمبر کا خصوصی معاملہ سمجھا۔ خلفاء راشدین سے جس بیعت کا ثبوت ملتا ہے وہ صرف بیعت سیاسی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیعت سیاسی کو ووٹنگ کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں ووٹنگ کا طریقہ رائج ہونے کے بعد بیعت سیاسی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیعت کا موجودہ طریقہ خلافت عباسی کے زمانہ میں اسلام کے آغاز کے تقریباً دوسو سال بعد رائج ہوا۔ اس اعتبار سے بیعت کے مروجہ طریقہ کو اسلامی شریعت کا کوئی منصوص جزء نہیں کہا جاسکتا۔ اس مروجہ طریقۂ بیعت کو اگر بدعت کہا جائے تو یہ ایک سخت بات ہوگی۔ کیوں کہ بہت سے صالحین امت کا نام اس میں

شامل ہے۔ اس لیے میں بطریق اہون یہ کہتا ہوں کہ یہ ہمارے بزرگوں کی ایک اجتہادی خطا تھی۔ اور جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے، اجتہادی خطاء پر بھی مومن کو ثواب ملتا ہے۔

تاہم بیعت کی ایک اور صورت ہے جس کو میں درست مانتا ہوں۔ میرے الفاظ میں یہ بیعت فطری ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ایک سفر کے دوران جابیہ کے مقام پر حضرت ابو عبیدہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب کے استقبال کے لیے آئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قدر دان تھے۔ چنانچہ دونوں نے آگے بڑھ کر یہ چاہا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ کو چوم لیں۔ (البدایہ والنہایہ، الجزء السابع صفحہ ۵۵)

صحابی کی طرف سے تقبیل ید کا یہ معاملہ ایک فطری معاملہ تھا نہ کہ کوئی شرعی معاملہ۔ ایسا ہی معاملہ میرے نزدیک اس چیز کا ہے جس کو میں بیعت فطری کہتا ہوں۔ یہ محبت اور اعتماد کا ایک غیر معمولی اظہار ہے۔ شرعی معنوں میں وہ نہ تو مقدس ہے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ جب آپ نے ایک بزرگ سے بیعت کرلی تو وہ آپ کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن بن گئی۔ خلاصہ یہ کہ میں فطری بیعت کا قائل ہوں، مگر غلو آمیز بیعت کا نہیں۔

میں نے ۱۹۶۶ میں مولانا عبد الباری ندوی سے جو بیعت کی تھی وہ اسی بیعت فطری کے معنی میں تھی۔ مولانا مرحوم کو میں نے دینی شخصیتوں میں ایک منفرد شخصیت کے طور پر دریافت کیا۔ اس دریافت کا نتیجہ علامتی طور پر بیعت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

میرٹھ کا شہر دہلی سے صرف ۷۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کو راجدھانی کا نواحی شہر کہا جا سکتا ہے۔ اس شہر کا راجدھانی کے نواح میں واقع ہونا اس کے لئے ایک قیمتی امکان ہے۔ ایسا شہر ہمیشہ بہت ترقی کرتا ہے۔ اس کی مثال دوسرے نواحی شہروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً غازی آباد، فرید آباد، گڑگاؤں، پانی پت، کرنال، وغیرہ۔

ان شہروں نے اپنی نواحی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یہ

ترقی اتنی نمایاں ہے کہ ان شہروں سے گزرنے والا آدمی پہلی نظر میں اس کو محسوس کر لیتا ہے۔ میرٹھ بھی ملک کی راجدھانی کے نواح میں واقع ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس کا معاملہ مذکورہ شہروں سے مختلف ہے۔

۱۰ ستمبر کو جب کہ میں میرٹھ کی سڑکوں اور اس کے محلوں سے بار بار گزرا تو مجھے وہاں شہری پچھڑے پن کے مناظر تو دکھائی دیے مگر جدید معنوں میں شہری ترقی کے مناظر میں وہاں نہ دیکھ سکا۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب خارج میں نہیں ہے بلکہ داخل میں ہے۔ میرٹھ کے لوگ اپنی جس تاریخ پر فخر کرتے ہیں، یہی تاریخ ان کی پسماندگی کا اصل سبب ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، ۱۸۵۷ کی مسلح جنگ میرٹھ سے شروع ہوئی۔ یہ جنگ ناکام ہو گئی۔ مگر ہمارے مقررین اور محررین نے اس مسلح کارروائی کو اتنا زیادہ گلوریفائی کیا کہ وہ میرٹھ والوں کے ذہن میں ایک پر فخر یاد کے طور پر باقی رہ گئی۔ حتی کہ وہ ان کی قومی روایات میں شامل ہو گئی۔ وہ نسل در نسل انہی پر فخر روایات میں جیتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرٹھ غالباً ہندستان کا واحد شہر بن گیا جہاں پچھلے ڈیڑھ سو سال کے درمیان چھوٹے یا بڑے تشدد کے واقعات برابر جاری رہے۔ ''چھری اور قینچی'' میرٹھ کے کلچر کی ایک علامت بن گئی۔

یہی متشددانہ مزاج میرٹھ والوں کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اسباب کی اس دنیا میں ترقی ہمیشہ امن کی طاقت سے ہوتی ہے نہ کہ تشدد کی طاقت سے۔ میرٹھ کے لوگ اپنی روایات کے نتیجہ میں اس حقیقت سے غافل رہے۔ وہ تشدد کی بنیاد پر اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا خواب دیکھتے رہے۔ اس قسم کا خواب حقائق کی اس دنیا میں کبھی واقعہ بننے والا نہیں، نہ میرٹھ والوں کے حق میں اور نہ غیر میرٹھ والوں کے حق میں۔

آپ کسی معلوماتی کتاب میں میرٹھ کے بارے میں پڑھیں تو اس میں آپ کو اس

قسم کے الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۵۷ کی مسلح شورش سب سے پہلے میرٹھ میں شروع ہوئی:

The initial uprising of the 1857 Indian mutiny occurred there (VI, p. 753)

اب میرٹھ میں کچھ نوجوانوں کے اندر گہرا دعوتی جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ عملاً دعوتی جدو جہد میں مصروف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہم کو ایک باقاعدہ پروگرام دیجئے تاکہ ہم یہاں اس کے مطابق، اپنا دعوتی کام کر سکیں۔

میں نے کہا کہ دعوتی عمل ایک سیلابی عمل ہے۔ اس کا کوئی لگا بندھا پروگرام نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو دریا کے اوپر ایک پل بنانا ہے یا ایک صنعتی کارخانہ قائم کرنا ہے تو آپ اس کا ایک لگا بندھا منصوبہ یا پروگرام بنا سکتے ہیں۔

مگر زندہ انسانوں کی دنیا میں دعوت حق کا کام اس نوعیت کا فنی کام نہیں۔ یہ ایک سیلابی نوعیت کا کام ہے۔ اس کا پیشگی طور پر کوئی متعین اور مقرر پروگرام نہیں بنایا جا سکتا۔ دعوت کے پروگرام کی اصل یہ ہے کہ آپ کے دل میں انسان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ آپ انسان کی نجات کے لئے تڑپ اٹھیں۔ آپ کو محسوس ہونے لگے کہ اگر میں نے دوسروں کو جنت میں لے جانے کی کوشش نہیں کی تو میری اپنی جنت بھی مشتبہ ہے۔

اس قسم کا طوفانی جذبہ جب آپ کے دل میں بھڑک اٹھے تو اس کے بعد کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دعوتی عمل کا پروگرام کیا ہے۔ اس کے بعد خود آپ کے سینہ کا طوفان آپ کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جائے گا کہ کب اور کس وقت آپ کو کیا کرنا چاہئے۔

میں نے کہا کہ عرب کے ایک سفر میں کچھ عرب نوجوانوں نے کہا کہ آپ نے دعوت کے موضوع کو بہت اچھی طرح کھولا ہے۔ دعوت کی اہمیت کو ہر پہلو سے واضح کیا ہے۔ مگر ابھی تک آپ نے دعوتی عمل کے لئے کوئی پروگرام نہیں دیا۔

میں نے کہا کہ قرآن دنیا کی سب سے بڑی دعوتی کتاب ہے۔ آپ سارا قرآن پڑھ جائیے مگر اس میں کہیں بھی وہ چیز نہیں ملے گی جس کو آج کل پروگرام کہا جاتا ہے۔ قرآن آدمی کے اندر دعوت کا سیلابی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کو اپنی فطرت پر اور اپنی عقل پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی کے اندر واقعی معنوں میں دعوت کا جذبہ بھڑک اٹھے تو اس کے بعد اس کو کسی رسمی قسم کے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاتے ہوئے میں نے عرب نوجوانوں سے کہا کہ ہمارا پروگرام، پروگرام ساز انسان بنانا ہے (برنامجنا هو اعداد المبرمجين)۔

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو بتاتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر دعوت کی تڑپ پیدا ہو جائے تو وہ کس طرح اپنے آپ میں ایک پروگرام ساز انسان بن جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ مظفر نگر (یوپی) کے ایک قصبہ کا واقعہ ہے۔ وہاں ایک مسلم خاندان کے یہاں ایک ہریجن عورت صفائی کے کام کے لئے روزانہ آتی تھی۔ گھر کی ایک بچی سے اس ہریجن عورت کی دوستی ہو گئی۔ یہ ہریجن عورت جب وہاں صفائی کے کام کے لئے آتی تو وہ سب سے پہلے مذکورہ بچی سے ملتی۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ گھر کے اندر جنت اور جہنم کا تذکرہ ہوا۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ جنت میں داخلہ کے لئے ایمان ضروری ہے۔ جو شخص مومن اور موحد ہو وہی موت کے بعد جنت میں جائے گا۔ اور جو لوگ مشرک ہیں، جو غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں وہ جنت میں نہیں جائیں گے۔ بچی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ میں تو مومن اور موحد ہوں اس لئے میں تو جنت میں جاؤں گی۔ مگر ہریجن عورت تو شرک میں مبتلا ہے، وہ کس طرح جنت میں جائے گی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اگلے دن جب مذکورہ ہریجن عورت صفائی کے کام کے لئے

آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی دوست بچی گھر میں ایک کنارے کھڑی ہوئی بری طرح رو رہی ہے۔ عورت اس کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے پوچھا کہ تم کو کیا تکلیف ہے۔ تم کیوں اس طرح رو رہی ہو۔ بہت پوچھنے کے بعد بچی نے کہا کہ میں مومن ہوں اس لئے میں جنت میں جاؤں گی اور تم مشرک ہو اس لئے تم جنت میں نہیں جاؤ گی۔ اس طرح موت کے بعد کی زندگی میں میرا اور تمہارا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ یہ سن کر ہریجن عورت نے کہا کہ تم مت روؤ۔ میں آج سے اسلام قبول کرتی ہوں تاکہ ہم دونوں ایک ساتھ جنت میں رہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اگر کسی کے دل میں دعوت کی آگ لگ جائے تو اس کے دل کی تپش خود ہی اس کو مکمل پروگرام بتا دیتی ہے، خواہ داعی ایک عام انسان ہو، اور خواہ وہ ایک چھوٹا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

میرٹھ کے جلسے میں کچھ تعلیم یافتہ ہندو بھی شریک تھے۔ بعد کو ایک ہندو نے کہا کہ آپ نے اپنی تقریر میں بہت اچھی باتیں کہیں۔ مگر آپ کی ایک بات ہم کو پسند نہیں آئی۔ وہ یہ کہ آپ کی بعض باتوں سے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ آپ اسلام کو سب سے اچھا مذہب سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اسلام دھرم سے بہتر کوئی اور دھرم نہیں۔

میں نے کہا کہ مذہب کا معاملہ ایک ذاتی عقیدہ کا معاملہ ہے۔ مذہب آدمی کو یہ یقین دیتا ہے کہ میں نے سچائی کو پالیا ہے، اس سچائی کو جس کو لے کر میں اس دنیا میں جی سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا یقین ہر آدمی کے لئے ضروری ہے۔ جو آدمی اس یقین سے خالی ہو وہ یا تو اعتماد کی نعمت سے محروم ہو گا یا وہ حقیقی سچائی سے کم تر کسی چیز کو وہ درجہ دے دے گا جو کہ سچائی کا درجہ ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کا عقیدہ اس کے سوا کچھ اور ہو تو مجھے آپ سے کوئی نفرت نہیں ہو گی۔ میں پھر بھی انسان ہونے کے اعتبار سے آپ سے محبت کروں گا۔ البتہ جب

ایسا ہو کہ میرا یقین کسی اور سچائی پر ہو اور آپ کا یقین کسی اور چیز پر تو ایسی حالت میں میں یہ کہوں گا کہ آیئے ہم دونوں اس موضوع پر سنجیدہ اور کھلا ڈائلاگ کریں۔ تاکہ ہم حقیقی سچائی تک پہنچ سکیں۔ کیوں کہ یہ یقین جتنا ضروری ہے کہ میں نے سچائی کو پالیا ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی کا یقین واقعی سچائی پر بنا ہو نہ کہ کسی اور چیز پر۔

انہوں نے کہا کہ حال میں نیو یارک میں مختلف مذاہب کے لوگوں کی جو میٹنگ ہوئی ہے اس میں تو یہ اعلان کیا گیا ہے:

It emphatically stated that all religions are equal.

میں نے کہا کہ اگر آپ یہ کہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر قابل احترام ہیں تو میں کہوں گا کہ ہاں، عزت اور احترام کے اعتبار سے ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں تو میں کہوں گا کہ نہیں۔ اس قسم کی بات خود مذہب کی نفی (negation) ہے۔

مذہب کیا ہے۔ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ اور سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے وحدت ہے، سچائی تعدد کا تحمل نہیں کر سکتی۔ سچائی اگر متعدد ہو تو وہ سچائی ہی نہ ہو گی۔

سچائی کی اہمیت یہ ہے کہ وہ دنیا میں جینے کے لئے آدمی کا اعتقادی سہارا ہے۔ سچائی وہ ہے جو آدمی کو اس قابل بنائے کہ وہ پورے یقین کے ساتھ دنیا کے ہنگاموں میں رہ سکے۔ اس قسم کا مستحکم اعتماد صرف اس یقین کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے کہ میں نے جس چیز کو پایا ہے وہ کامل سچائی ہے۔ جس مذہب کی صداقت پر آدمی کو کامل یقین نہ ہو وہ ایک سیاسی مذہب یا مصلحت پرستانہ مذہب تو ہو سکتا ہے مگر حقیقی معنوں میں اس کو مذہب کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اس قسم کا عقیدہ صرف منافقانہ کردار پیدا کرتا ہے نہ کہ مخلصانہ کردار۔

میرٹھ میں کچھ لوگوں نے وہاں حلقۂ الرسالہ کے نام سے ایک فورم بنایا ہے جس کے تحت وہ لوگ دعوتی کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کے حلقے ملک بھر میں جگہ جگہ قائم

ہیں۔ اس معاملہ میں مجھے ناگپور کی مثال پسند آئی۔

ناگپور میں الرسالہ کے قارئین نے اسی قسم کا ایک حلقہ بنایا ہے۔ مگر اس کا نام انہوں نے حلقۂ الرسالہ کے بجائے پازیٹیو تھنکرس فورم (Positive Thinkers' Forum) رکھا ہے۔ یہ نام نہایت بامعنی ہے اور مجھ کو پسند ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہر جگہ الرسالہ کے لوگ اسی نام کو استعمال کریں۔ کثرت استعمال سے انشاء اللہ 'پازیٹیو تھنکرس فورم' حلقۂ الرسالہ کے لفظ کا بدل بن جائے گا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے سے پہلے جب اشتراکی افکار کا زور تھا تو اس زمانہ میں اس سے متاثر ادیبوں نے جگہ جگہ اپنے حلقے بنائے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اشتراکیت پسند ادیب نہیں کہتے تھے بلکہ ترقی پسند ادیب (Progressive Writer) کہتے تھے۔ یہ لفظ زیادہ بامعنیٰ نہ تھا۔ وہ صرف قدیم سوچ سے بغاوت کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ ایک منفی نام تھا۔ اس کے برعکس پازیٹیو تھنکرس فورم پورے معنوں میں ایک مثبت نام ہے۔ وہ ایجابی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔

محمد شہزاد علی خاں صاحب نے بتایا کہ کچھ لوگ آپ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ آپ اکثر سیاسی معاملات میں رائے دیتے ہیں جو ٹی وی، اور اخبارات میں آتی رہتی ہے۔ یہ بزرگوں کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اگر آپ دینی مشن لے کر چل رہے ہیں تو آپ کو سیاسی معاملات سے الگ رہ کر خالص دین کے دائرہ میں اپنا کام کرنا چاہئے۔

میں نے کہا کہ یہ صرف غلط فہمی ہے جو ایک غلط مفروضہ پر قائم ہے۔ وہ یہ کہ عالم اور بزرگ وہ ہے جو سیاست سے دور رہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ آج ایسا ہے۔ ماضی میں حضرت عائشہ اور حضرت حسین نے وقت کی سیاست میں حصہ لیا۔ امام ابو حنیفہ نے نفسِ ذکیہ کے سیاسی مشن میں ان کے ساتھ تعاون کیا۔ امام ابن تیمیہ اپنے زمانہ کے سیاسی حکمرانوں کے معاملات میں جرأت مندانہ طور پر اظہار خیال کرتے تھے۔

ہندستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بہت سے علماء سیاسی معاملات میں اظہار خیال کرتے رہے ہیں، حتی کہ ان لوگوں میں سے کئی لوگوں نے سیاسی معاملات میں عملی حصہ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ کوئی شخص اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔

اگر کچھ بزرگ یا دین دار حضرات سیاست سے دور رہیں حتی کہ وہ اخبارات بھی نہ پڑھیں تو یہ ان کا ذاتی ذوق ہے۔ ذاتی ذوق کے اعتبار سے اس میں کچھ حرج نہیں۔ لیکن وہ اگر اس ذاتی ذوق کو اسلام کا معیار قرار دیں اور سیاسی معاملات میں بے غرضانہ طور پر صالح رہنمائی دینے والوں کو بے دین سمجھیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ یا تو جہل میں مبتلا ہیں یا انتہا پسندی کا شکار ہیں۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے کہا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ (البخاری) اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کلمہ گو کے لئے جنت ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق من قال لا الٰہ الا اللہ سے مراد من تلفظ لا الٰہ الا اللہ نہیں ہے۔ یعنی مجرد کلمہ کے الفاظ کی تکرار پر جنت نہیں ہے بلکہ اعتراف حق پر ہے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ من عرف أن لا إلٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث میں ''قول'' سے مراد قول معرفت ہے۔ گویا جنت معرفت پر ہے نہ کہ مجرد قول پر۔

یہ بات قرآن سے واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ المائدہ کی آیت ۸۳۔۸۵ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ایک گروہ کو اللہ نے جنت دی اور یہ جنت ان کو ان کے قول کے بدلے میں ملی۔ (فاثابھم اللہ بما قالوا جنتٍ) مگر یہ قول کیا تھا۔ قرآن کے

مطابق، یہ ان کے داخلی عرفانِ حق کا ایک لسانی اظہار تھا (مما عرفوا من الحق) مزید یہ کہ ان کا یہ عرفان اتنا گہرا تھا کہ اس کے زیر اثر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ (أعینهم تفیض من الدمع)

ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن ہر حال میں جنت میں جائے گا خواہ وہ زانی ہو یا سارق ہو، کیا یہ حدیث صحیح ہے اگر صحیح ہے تو آپ اس حدیث کی تشریح کس طرح کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر آپ جو اس کا مفہوم لے رہے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اس حدیث میں دراصل اسی مسئلہ کو بتایا گیا ہے جو قرآن میں لَمَم کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل نجات وہ ہیں جو کبائر و فواحش سے اجتناب کرتے ہیں سوائے لَمَم کے (النجم ۳۲)

یہاں لمم سے مراد وقتی وقوع ہے۔ یعنی جذبات کے شدید غلبہ کے تحت کبھی اتفاقاً ملوث ہو جانا۔ اور پھر شدید احساس ندامت کے ساتھ اس سے تائب ہونا۔

یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ حدیث میں جو لفظ ہے وہ وإن زنیٰ و إن سرق کا لفظ ہے، نہ کہ یزنی اور یسرق کا لفظ۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی استمراری طور پر اس قسم کا فعل کرتا رہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اتفاقی طور پر کبھی انسانی کمزوری سے مجبور ہو کر اس سے ایسا فعل سرزد ہو جائے اور پھر وہ شدت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور یہ پختہ فیصلہ کرے کہ آئندہ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ' آیت اور حدیث دونوں میں اصلاً جس چیز کی اہمیت بتائی گئی ہے وہ سادہ طور پر وقوع گناہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مومن سے اگر کبھی بشری تقاضا کے تحت کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کا حال کیا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد اس کو گناہ کے احساس سے تڑپ اٹھنا چاہئے۔ اس کا یہ احساس اتنا شدید ہونا چاہئے کہ اس کی

آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جائے، یہاں تک کہ فرشتے کہہ اٹھیں کہ اے رب، اپنے اس بندے کو معاف فرمادے۔ کیوں کہ اس نے اتنے آنسو بہائے ہیں جو اس کے گناہ کو دھونے کے لئے کافی ہوں۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آخرت کے بارے میں جو نصوص (آیات و احادیث) آئی ہیں وہ بظاہر متعارض ہیں۔ اُن سے آخرت کی تصویر واضح نہیں ہوتی۔ مثلاً بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتے ہی فوراً انسان اپنے حقیقی انجام سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں قیامت کے دن حساب و کتاب ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مرتے ہی انسان جنت یا جہنم میں چلا جاتا ہے تو ان آیتوں اور روایتوں کی کیا تاویل کی جائے جن کے مطابق بظاہر تمام انسانوں کے خاتمہ کے بعد ایسا ہونے والا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ سارا اشکال اس لئے ہے کہ ہم زمان و مکان کے دنیوی تصور کے تحت آخرت کے معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ قیاس مع الفارق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے بعد فوراً ہی زمان و مکاں کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ماضی و حال اور مستقبل کا وہ فرق باقی نہیں رہتا جو موجودہ دنیا میں ہمیں محسوس ہوتا ہے۔

یہ اشکال اس لئے ہے کہ ہم واقعات کو فاصلوں کے اعتبار سے سمجھنے کے عادی ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں کچھ ایسی چیزیں رکھ دی ہیں جن کے ذریعہ ہر آدمی یہ تجربہ کرتا ہے کہ فاصلوں کا معاملہ اضافی ہے۔ مثلاً ہر آدمی کا تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایسے خواب نظر آتے ہیں جس میں وہ ایک لمحہ میں لمبی مدت کے درمیان ہونے والے واقعات کو دیکھ لیتا ہے۔ یہی معاملہ تصور کا ہے۔ ہر آدمی کا تجربہ ہے کہ ایک لمحہ کے اندر اس کا خیال ہزاروں میل سے بھی زیادہ سفر کر سکتا ہے۔ مثلاً آپ دہلی میں بیٹھے ہوئے اپنے خیال کو ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں نیویارک پہنچا سکتے ہیں۔ یا

آنکھ بند کرتے ہی ایک لمحہ میں سورج یا چاند کو اپنے تصور میں لا سکتے ہیں۔ یہ بات اب سائنسی مطالعہ کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہے کہ زمان و مکاں کے تصورات اضافی ہیں۔ اس نظریہ کو سائنس میں نظریۂ اضافیت (relativity) جاتا ہے۔

یہ چیزیں آخرت کے معاملہ کو ہمارے لئے قابل فہم بنا رہی ہیں۔ ان کے ذریعہ یہ امکان ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی دنیا بھی ہو سکتی ہے جہاں زمانی بُعد اور مکانی فاصلے مٹ گئے ہوں۔ حال اور مستقبل کا وہ فرق باقی نہ رہا ہو جو ہم کو موجودہ محدود دنیا میں نظر آتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آدمی جب مر کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو منکر نکیر اس سے تین سوال کرتے ہیں۔ مَن ربّک، من رسولک، ما دینک۔ انہوں نے کہا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قبر کا معاملہ بہت آسان ہے۔ ان سوالات کا جواب تو ہر مسلمان دے سکتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی مسلمان ہو۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب قرآن میں موجود ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد لفظی جواب نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی جواب ہے۔ یعنی سوال کا مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم نے اپنی زندگی میں حقیقی طور پر اللہ کو اپنا رب بنایا تھا۔ کیا تم نے حقیقی طور پر رسول کو اپنے لئے اسوہ بنایا تھا۔ کیا تم نے دین اسلام کو حقیقی طور پر اپنا دین قرار دیا تھا۔

اس تفسیر کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے پر زور الفاظ میں کہا کہ نشہد انک لرسول اللہ۔ مگر اللہ نے ان کے اس قول کو نہیں مانا۔ اور فرمایا کہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں (المنافقون)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقبول جواب وہ ہے جو حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہو۔

قبر میں صرف وہ جواب کسی کے کام آئے گا جو واقعۃً سچائی پر مبنی ہوگا۔ یعنی آدمی کی زندگی اسی کے مطابق گزری ہو۔ اس کے برعکس اگر اس کا جواب جھوٹ پر مبنی ہو تو

وہ ایک ایسی بات کا دعویٰ کر رہا ہے جو اس کی حقیقی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آخرت میں بھی اس کا جواب اسی طرح رد کر دیا جائے گا جس طرح دنیا میں منافقین کے جواب کو رد کر دیا گیا (المنافقون)۔

الرسالہ کے ایک قاری نے کہا کہ میرا تجربہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا دینی شاکلہ صوفیا کے زیر اثر بنا ہے۔ چنانچہ تقریباً تمام عوام و خواص متصوفانہ شاکلہ کے تحت سوچتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی عوامی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ اس نے معمولی فرق کے ساتھ اس مانوس متصوفانہ ڈھانچہ کو اختیار کر لیا۔ اس کے برعکس جن جماعتوں یا تحریکوں کا ڈھانچہ متصوفانہ نہ تھا وہ عوام میں زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس بارے میں آپ اپنی رائے بتائیں۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے آپ تعرف الاشیاء باضدادھا کے اصول کا انطباق کریں۔ وہ یہ کہ یہ معاملہ جو آپ ہندستان میں دیکھتے ہیں وہ عرب دنیا میں سرے سے موجود نہیں۔ جب کہ عربوں کو اسلام براہ راست رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ ملا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کی زبان عربی ہے اور جن کو دین براہ راست رسول اور اصحاب رسول سے ملا۔ ان کا نمونہ درست نمونہ ہے یا ان لوگوں کا جن کو دین بالواسطہ ملا۔

میں صوفیا کا یا تصوف کا مخالف نہیں ہوں۔ میں خود اپنے آپ کو ایک صوفی سمجھتا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ ہندستان میں جو دینی شاکلہ بنا وہ خدا پرستی سے زیادہ بزرگ پرستی سے قریب تھا۔

میرا احساس یہ ہے کہ ہندستان میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعلیم و تربیت نہ ہونے کی وجہ سے یہاں دین کا وہ ڈھانچہ بن گیا جس کو میں بزرگ پرستی کہتا ہوں۔

ہندو قوم ایک ایسی قوم تھی جس کا پورا مذہب گرو کے تصور پر قائم تھا۔ گرو سے

گیان لینا، گرو سے آشیر واد لینا، گرو کے واسطہ سے نجات حاصل کرنا یہاں تک کہ یہ سمجھنا کہ گرو اور بھگوان میں کوئی فرق نہیں۔ اس قسم کے ذہن کے لوگ بہت بڑی تعداد میں اسلام میں اس طرح داخل ہوئے کہ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان تو ہو گئے مگر ان کے مزاج پر بدستور ہندو روایت کا غلبہ قائم رہا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہندستان میں بزرگ پرستی اور اکابر پرستی پر مبنی اس مذہب کی صورت اختیار کر لی جو آج مسلمانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

اس ہندستانی اسلام کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مومن کا جو تعلق اللہ سے ہونا چاہئے وہ تعلق مفروضہ بزرگوں سے قائم ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ دین وہ ہے جو ان کے بزرگوں سے ملے۔ ان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ سب انہیں بزرگوں کی برکت سے ملتا ہے۔ حتی کہ جنت بھی ان کو انہیں بزرگوں کے طفیل سے ملے گی۔ ان کا خیال یہ ہو جاتا ہے کہ ان بزرگوں کا چہرہ دیکھنا اور ان کے پاس بیٹھنا' ان کی خدمت کرنا' ان کی برکت حاصل کرنا، ان کے ملفوظات سننا، بس انہی چیزوں کا نام دین ہے۔ مگر یقینی ہے کہ یہ ایک خود ساختہ مذہب ہے۔ اس کا قرآن و حدیث والے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن و سنت کے مطابق، حقیقی اسلام وہ ہے جو اللہ کی معرفت پر قائم ہو۔ جس میں محبت اور خوف کے جذبات صرف ایک اللہ سے وابستہ ہو گئے ہوں۔ جو آدمی کو اللہ کی عظمت و جلال کی یاد میں جینے والا بنا دے۔ جس میں انسان اللہ کی طرف بھاگے اور یہ یقین رکھے کہ جو کچھ اسے ملے گا اللہ سے ملے گا۔ کسی انسان سے اس کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔

جناب ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سیفی نے کہا کہ شب برأت کے موقع پر ہمارے یہاں کچھ اشتہار لگتے ہیں۔ بعض میں شب برأت کی فضیلت کو ثابت کیا جاتا ہے اور بعض پرچوں میں اس کی تردید کی جاتی ہے۔ مسلمان کش مکش میں پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ کش مکش کی بات نہیں ہے بلکہ دین کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہونے کی بات ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اپنے بیٹے اور بیٹی کی ترقی کے لئے ایک رات کی دھوم پر یقین کر لے یا کچھ وقتی رسوم ادا کر کے یہ سمجھے کہ اس کے تمام معاشی معاملات درست ہو جائیں گے۔ لوگ چوں کہ اپنے ذاتی معاملات میں سنجیدہ ہیں اس لئے وہ ایسے معاملہ میں، ٹونا اور ٹوٹکہ جیسی چیزوں پر یقین نہیں کرتے مگر دینی معاملات میں وہ سنجیدہ نہیں اس لئے ان کو یہ آسان نظر آتا ہے کہ سال میں ایک رات کی دھوم مچاؤ اور جنت میں چلے جاؤ۔

مزید میں نے کہا کہ اس قسم کی دھوم والا اسلام براہ راست طور پر ہندو روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے یہاں خشوع اور تقویٰ والے دین کا کوئی تصور نہیں۔ ان کے نزدیک خدا کوئی علیحدہ ہستی نہیں جس کے ساتھ اپنی توجہات کو وابستہ کیا جائے۔ وہ نمائشی رسموں، جلوس، کیرتن، نوراتری اور جاگرن، جیسی دھوم والی چیزوں کو مذہب سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ہندستان کے مسلمان، ہندو مذہب کو اسلامائز نہ کر سکے۔ البتہ ہندو مہذب نے یہاں کے اسلام کو ہندوائز کر لیا۔ اسلام سے پہلے عرب کے لوگوں میں جو مذہب تھا وہ تالی بجانا اور سیٹی بجانا، اور گانے، باجے جیسی چیزوں پر مشتمل تھا۔ اسلام نے، اس نمائشی مذہب کو سنجیدہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ہندستان میں اس کے برعکس یہ ہوا کہ خدا کے دیئے ہوئے سنجیدہ مذہب کو یہاں کے لوگوں نے دوبارہ نمائش اور دھوم اور شعر خوانی کے مذہب میں تبدیل کر دیا۔

الرسالہ کے ایک قاری نے کہا کہ آپ نے جو یہ عالمی دعوتی مشن چلایا ہے اور اس میں اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس کے لئے لازمی تھا کہ آپ معاشی اعتبار سے فارغ ہوں۔ تو آپ نے اپنے معاشی مسائل کو کیسے حل کیا۔

میں نے کہا کہ ابتداء عمر سے ہی میرے اندر دینی خدمات کا جذبہ تھا۔ میں جب

بھی خدا سے دعا کرتا تھا تو ہمیشہ میری زبان سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدایا، تو مجھے اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے۔ تاہم یہ سوال میرے ذہن میں باقی رہتا تھا کہ جب میں اپنا پورا وقت اور اپنی پوری طاقت دین کی خدمت میں لگا رہا ہوں تو میری معاشی ضروریات کیسے پوری ہوں گی۔ اس کا جواب مجھے قرآن اور حدیث میں ملا۔ قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ سے، میں نے سمجھا کہ دعوت کا عمل بندے کی ذمہ داری ہے۔ اور رزق کی فراہمی اللہ کی ذمہ داری۔ آخری بار جس چیز نے مجھے اس معاملہ میں یکسو کر دیا وہ ابن ماجہ اور البیہقی کی یہ روایت تھی:

من جعل الهموم هماً واحدا همّ آخرته كفاه الله عن هموم الدنيا (مشكوة المصابيح ۱/ ۸۷) جس شخص نے اپنے سارے غموں کو ایک غم بنا لیا، آخرت کا غم، تو اللہ اس کی دنیا کے غموں کے لئے کافی ہو جائے گا۔

اللہ کی توفیق سے میں نے اس حدیث کو پورے اعتماد کے ساتھ پکڑ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری پوری زندگی اس حدیث کی عملی تفسیر ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اللہ نے میرے ساتھ وہ معاملہ فرمایا جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ووجدک عائلا فاغنیٰ (الضحیٰ)

میری پوری زندگی گویا ومن يتوكل على الله فهو حسبه کا تجربہ ہے۔ میں اکثر اپنے گھر میں اپنے بیوی بچوں سے کہتا ہوں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ براہ راست اور بلاواسطہ اللہ کا عطیہ ہے، خواہ وہ کوئی چھوٹی چیز ہو یا کوئی بڑی چیز۔

اس تجربہ کا مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں ہر لحہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اللہ کے دئے ہوئے سے پا رہا ہوں نہ کہ اپنی محنت کی کمائی سے۔

جناب محمد عارف صاحب میرٹھ (شاستری نگر) فیصل مسجد کے امام ہیں۔ میرے سفر سے پہلے میرٹھ کے ایک صاحب نے ان کو ماہنامہ الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا۔ اس

وقت وہ الرسالہ سے اس قدر بد ظن تھے کہ انہوں نے اس کو واپس کر دیا اور کہا کہ مجھے الرسالہ پڑھنا نہیں ہے۔ پھر میرٹھ کے لئے جب میرا پروگرام بنا تو الرسالہ کے بعض قارئین نے ان کو اس کی اطلاع دی اور انہیں اجتماع میں شرکت کی دعوت دی۔ اس دعوت کو انہوں نے قبول کر لیا اور اجتماع میں آکر میری تقریر سنی اور ہماری مجلس میں بیٹھے۔ اس کے بعد ان کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

ملاقات سے پہلے میں آپ کے خلاف نہایت بد ظنی کا شکار تھا۔ لیکن حضرت والا کی ملاقات کے بعد فوراً ہی ذہن اور قلب متاثر ہوا اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ حضرت والا کی تقریر اور ملاقات کا انداز بالکل ہمارے آقا ﷺ کے طریقہ پر تھا۔ حقیقت میں اس بات کو قسم کھا کر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت والا کا نظریہ بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق ہے۔ کھانے پینے میں چلنے پھرنے میں اور گفتگو کرنے میں اور ملاقات کرنے میں وہ طریقہ نہیں تھا جیسا کہ آج کے علماء کے اندر بناوٹ اور اکڑ فوں پائی جاتی ہے بلکہ آپ کو دیکھ کر اور ملاقات کر کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے آقا کا طریقہ تھا۔ جو چاہتا سوال کرتا تو اس کا ضرور جواب دیا جاتا۔ اور اگر کوئی جہالت کا سوال کرتا تو اس کا بھی جواب دیا جاتا اور اگر وہ اپنی جہالت پر اڑا رہتا تو اس سے اعراض فرمایا جاتا۔ آپ کی گفتار آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قرآن و حدیث کے عین مطابق پایا جاتا ہے۔ اللہ ہمارے سر پر حضرت کا سایہ تا دیر قائم رکھے، آمین۔ (محمد عارف)

میرٹھ میں ایک صاحب ہیں جن کا نام ابرار صدیقی ہے۔ کسب معاش کے اعتبار سے وہ رکشہ چلاتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ الرسالہ کے شمارے رکھتے ہیں اور جب بھی اور جہاں بھی وقت ملتا ہے وہ الرسالہ کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے ان کا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ الرسالہ کے عاشق ہیں۔ رکشہ ان کے لئے کسب معاش کا ذریعہ ہے اور الرسالہ ان کے لئے روحانی زندگی کا ذریعہ۔ مزید یہ کہ

وہ رکشہ کے ذریعہ نہ صرف مسافروں کو اِدھر سے اُدھر پہنچاتے ہیں بلکہ ان کا "رکشہ" الرسالہ مشن کی اشاعت کا چلتا پھرتا ذریعہ بن گیا ہے۔ وہ لوگوں کے پاس جاکر الرسالہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ میرٹھ کے بعض نوجوان جو گہرے طور پر الرسالہ سے متاثر ہیں ان کو سب سے پہلے الرسالہ ابرار صدیقی صاحب کے ذریعہ ہی ملا۔

میرٹھ میں کچھ نوجوان الرسالہ مشن سے اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ انہوں نے اس کو اپنا مقصد حیات بنالیا ہے۔ مثال کے طور پر محمد شہزاد علی خاں صاحب، محمد ساجد خاں صاحب، اور ماسٹر محمد نفیس صاحب، محمد راشد صاحب انصاری' ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سیفی' وغیرہ۔ ان لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہفتہ میں چھ دن وہ اپنا کام کرتے ہیں اور ایک دن چھٹی کر کے الرسالہ کی اشاعت کرتے ہیں۔ وہ سائیکل اور اسکوٹر پر الرسالہ اور کتابیں لے کر نکلتے ہیں اور مختلف لوگوں کے یہاں جاکر ان سے ملتے ہیں۔ ان سے باتیں کرتے ہیں اور انہیں الرسالہ یا کتاب پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ صاحبان اس اصول کا عملی نمونہ بن گئے ہیں جس کو الرسالہ میں "ون مین ٹو مشن" کے الفاظ میں بتایا گیا تھا۔

ان صاحبان کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی سے ملتے ہیں تو الرسالہ کے مختلف شمارے اس کے سامنے اس طرح رکھ دیتے ہیں کہ وہ صفحہ اول پر چھپے ہوئے اقوال کو پڑھ سکے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ان اقوال سے متاثر ہوتے ہیں اور فوراً الرسالہ پڑھنے کے لئے لے لیتے ہیں۔ یہ طریقہ وہ اردو اور انگریزی دونوں رسالوں کے لیے اختیار کئے ہیں۔

میرٹھ کے مختلف مقامات کے پروگراموں میں شرکت کے بعد شام کو منڈولی کے لئے روانگی ہوئی۔ جب میں گاڑی میں بیٹھ چکا تو بہت سے لوگ مصافحہ کرنے کے لئے آئے۔ میں نے دیکھا کہ مجھے رخصت کرتے ہوئے بعض نوجوانوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب، ہمارے لیے دعا کیجئے۔ میں نے ان

کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں آپ کو قبول فرمائے۔

ایک اور نوجوان نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب آپ آخرت میں گواہ رہیے گا کہ ہم نے اپنی زندگی کو دعوت الی اللہ میں لگایا۔ میں نے کہا کہ یہ میری گواہی کا معاملہ نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں کوئی چار انگشت جگہ ایسی نہیں، جہاں اللہ کا فرشتہ موجود نہ ہو۔ یہ فرشتے میرے جیسے انسان سے پہلے آپ کے عمل کا اندارج اپنے دفتر میں کر چکے ہوتے ہیں۔ آخرت کے دن یقیناً وہ آپ کے حق میں اپنی گواہی دیں گے۔

میرٹھ کے اس سفر میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے چند نوجوان بے حد مخلص اور دعوت کا سچا جذبہ رکھنے والے نظر آئے۔ ان کے نام یہ ہیں: محمد شہزاد علی خاں، محمد ساجد خاں، ماسٹر محمد نفیس انصاری، ڈاکٹر ذوالفقار، محمد راشد، وغیرہ۔ میرٹھ جیسے شہر میں ایسے سنجیدہ اور داعیانہ جذبہ رکھنے والے نوجوان مجھے تعجب خیز حد تک قابلِ قدر نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کے نیک جذبات کو قبول فرمائے۔

میرٹھ کے پروگرام سے فارغ ہو کر مغرب کی نماز کے بعد وہاں سے واپسی ہوئی۔ پہلے ہم لوگ منڈولی پہنچے جو دہلی کے اطراف میں ایک گاؤں ہے۔ یہاں مولانا محمد راشد خاں قاسمی صاحب کے مدرسہ تحفیظ القرآن میں کچھ دیر قیام رہا۔ یہاں کے مہتمم مولانا محمد اطہر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری تحریروں کو الجمعیۃ کے زمانہ سے پڑھتے چلے آرہے ہیں ' انھی کی گاڑی میں یہ پورا سفر ہوا۔ عشاء کی نماز اسی مدرسہ میں پڑھی گئی۔ یہاں مختلف لوگوں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ منڈولی سے واپس ہو کر ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ کی رات کو ہم لوگ دہلی پہنچے۔

[redacted] [redacted]

[redacted] [redacted]

[redacted]

[redacted]

[redacted]

[redacted]